اِقْبَالْ

مشرق کا بلند ستارہ

اِقبالؒ

مشرق کا بلند ستارہ

رہبر معظم سید علی خامنہ ای حفظہ اللہ

معراج کمپنی

بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

نام کتاب: اقبال مشرق کا بلند ستارہ
مؤلف: رہبر معظم سید علی خامنہ ای
کمپوزنگ: انس کمیونیکیشن 0300-4271066
ناشر: معراج کمپنی لاہور
زیرِ اہتمام: ابوظہیر

ملنے کا پتہ

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد

عَرضِ ناشر

ہم نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ آپ کی خدمت میں بہترین کتب پیش کریں اور اپنے بزرگوں کی کاوشوں کو آپ کے لئے شائع کریں، اسی سلسلہ میں اس سے قبل جناب سید العلماء سید علی نقی نقوی نقن رحمۃ اللہ علیہ کی کتب شائع کی ہیں اور وہ سلسلہ بھی جاری ہے اور اس کے ساتھ آپ کی دعاؤں اور اللہ کی رحمت اور توفقیات سے اب جناب رہبر معظم سید علی خامنہ ای مدظلہ کی کتب کا سلسلہ اشاعت کا آغاز کیا جا رہا ہے۔

اگر اللہ نے توفیق دی تو انشاء اللہ ہم جناب رہبر معظم کی تمام کتب جو دستیاب ہوں گی ان کو مرحلہ وار شائع کریں گے۔ اس سلسلہ میں آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اگر آپ کے پاس رہبر معظم کی کوئی کتاب ہوتو ادارہ کو ارسال کر کے ممنون فرمائیں۔

جب آپ اپنے لئے دعا کریں تو ہمیں اپنی دعاؤں میں شریک رکھیں تا کہ یہ سلسلہ جاری رہ سکے، اگر کتاب میں کوئی غلطی نظر آئے تو یہ سوچ کر معاف فرما دیں کہ انسان کی سب کوششوں کے باوجود غلطی کی گنجائش بہر حال رہ جاتی ہے، اس غلطی سے ادارہ کو آگاہ کریں تا کہ آئندہ اس کو درست کر لیا جائے۔

کہنے کو تو یہ ایک تقریر ہے لیکن علامہ اقبال کی شخصیت، افکار، احساسات، زندگی غرض یہ کہ اس ایک تقریر میں آپ سے متعلق وہ سب کچھ ہے کہ جس سے علامہ اقبال کا مشرق کا بلند ستارہ ہونا ثابت ہے۔ انہوں نے علامہ اقبال بین الا قوامی کانفرنس بتاریخ ١٩٨٦ء کو تہران یونیورسٹی میں خطاب فرمایا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

میں خلوص دل سے عرض کررہا ہوں کہ آج حضرت اقبال کی عظمت میں جلسہ منعقد کیا جارہا ہے تو یا میری زندگی کے پر جوش اورانتہائی یادگار دنوں میں سے ہے۔وہ درخشاں ستارہ جس کی یاد، جس کا شعر، جس کی نصیحت اور سبق کٹھن کے تاریک ترین ایام میں ایک روشن مستقبل کو ہماری نگاہوں کے سامنے مجسم کررہا تھا، آج خوش قسمتی سے ایک مشعل فروزاں کی طرح ہماری قوم کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیے ہوئے ہے۔

ہماری عوام جو دنیا میں اقبال کے پہلے مخاطب تھے، افسوس کہ وہ کافی بعد میں اس سے آگاہ ہوئے، ہمارے ملک کی خاص صورت حال،خصوصاً اقبال کی زندگی کے آخری ایام میں ان کے محبوب ملک ایران میں منحوس استعماری سیاست کا غلبہ اس امر کا باعث بنا کہ وہ کبھی ایران نہ آئے۔

فارسی کے اس عظیم شاعر جس نے اپنے زیادہ تر اشعار اپنی مادری زبان میں نہیں بلکہ فارسی میں کہے،کبھی اپنی پسندیدہ اور مطلوب فضا، ایران میں قدم نہیں رکھا، اور نہ صرف یہ کہ وہ ایران نہ آئے بلکہ سیاست نے، جس کے خلاف اقبال عرصہ درازتک برسرِ پیکار رہے، اس بات کی اجازت نہ دی کہ اقبال کے نظریات و افکار کا بتایا ہوا راستہ اور درس ایرانی عوام کے کانوں تک پہنچے جسے سننے کیلئے وہ سب سے زیادہ بے تاب تھے۔اس سوال کا جواب کہ کیوں اقبال ایران نہیں آئے، میرے

پاس ہے۔

جب اقبال کی عزت وشہرت عروج پر تھی اور جب برصغیر کے گوشہ و کنار میں اور دنیا کی مشہور یونیورسٹیوں میں انہیں ایک عظیم مفکر، فلسفی، دانشور، انسان شناس اور ماہر عمرانیات کے طور پر یاد کیا جاتا تھا، ہمارے ملک میں ایک ایسی سیاست نافذ تھی کہ ایران آنے کی دعوت نہ دی گئی اور ان کے ایران آنے کے امکانات فراہم نہ کئے گئے۔سالہا سال تک ان کی کتابیں ایران میں شائع نہ ہوئیں۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب اس ملک میں ایرانی اور مسلمان کے تشخص کو نابود کرنے کیلئے غیر ملکی ادب و ثقافت کا تباہ کن سیلاب رواں تھا۔اقبال کا کوئی شعر اور کوئی تصنیف مجالس و محافل میں عوام کے سامنے نہ لائی گئی۔

آج اقبال کی آرزو یعنی اسلامی جمہوریت نے ہمارے ملک میں جامہ عمل پہن لیا ہے۔ اقبال لوگوں کی انسانی اور اسلامی شخصیت کے فقدان سے غمگین رہتے تھے اور اسلامی معاشروں کی معنوی ذلت اور ناامیدی کو سب سے بڑے خطرے کی نگاہ سے دیکھتے تھے، لہٰذا انہوں نے اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ مشرقی انسان اورخصوصاً مسلمان کی ذات اوروجود کے لئے کام کیا۔

فارسی زبان جس نے اپنے اقبال کے ذہن کے ساتھ زندگی گزاری ہے، بات کروں تا کہ اس عظیم اجتماع میں اپنے اوپر ان کے عظیم احسان اور اپنے عزیز لوگوں کے ذہن پر ان کے اثرات کے عظیم حق کو کسی حد تک ادا کرسکیں۔

اقبال تاریخ اسلام کے نمایاں، عمیق اوراعلیٰ شخصیتوں میں سے ہیں کہ ان کی خصوصیات اور زندگی کے صرف ایک پہلو کو مدنظر رکھا جاسکتا اور ان کے صرف اس پہلو اور اس خصوصیت کے لحاظ سے تعریف نہیں جاسکتی۔ اگر ہم صرف اسی پر اکتفا کریں اور کہیں کہ اقبال ایک فلسفی ہیں اور ایک عالم ہیں تو ہم نے حق ادا نہیں کیا۔ اقبال بلاشک ایک عظیم شاعر ہیں اور ان کا بڑے شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ اقبال کے

اردو کلام کے بارے میں اردو زبان و ادب کے ماہرین کہتے ہیں کہ بہترین ہے، شاید یہ تعریف، اقبال کی بڑی تعریف نہ ہو کیونکہ اردو زبان کی ثقافت اور نظم کا سابقہ زیادہ نہیں ہے لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے اردو کلام نے بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں برصغیر کے افراد پر (خواہ ہندو ہوں یا مسلمان) گہرا اثر ڈالا ہے اور ان کو اس جد وجہد میں اس وقت تدریجی طور پر بڑھ رہی تھی، زیادہ سے زیادہ جوش دلایا ہے۔خود اقبال بھی مثنوی اسرار خودی میں کہتے ہیں :

باغبان زور کلام آزمود

مصرعی کارید و شمشیر ی درود

اور میرا استنباط یہ ہے کہ وہ یہاں پر اپنے اردو کلام کے بارے میں کہتے ہیں جو اس وقت برصغیر کے تمام لوگوں کے لئے جانا پہچانا تھا۔

اقبال کا فارسی کلام بھی میرے نزدیک شعری معجزات میں سے ہے۔ ہمارے ادب کی تاریخ میں فارسی میں شعر کہنے والے غیر ایرانی بہت زیادہ ہیں لیکن کسی کی بھی نشان دہی نہیں کی جاسکتی جو فارسی میں شعر کہنے میں اقبال کی خصوصیات کا حامل ہو۔

اقبال فارسی بات چیت اور محاورے سے ناواقف تھے اور اپنے گھر میں اور اپنے دوستوں سے اردو یا انگریزی میں بات کرتے تھے۔ اقبال کو فارسی مضمون نگاری اور فارسی نثر سے واقفیت نہیں تھی اور اقبال کی فارسی نثر وہی تعبیرات ہیں جو انہوں نے، اسرارخودی، اور رموز بےخودی کی ابتدائی میں تحریر کی ہیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ ان کا سمجھنا فارسی زبان والوں کے لئے مشکل ہے۔

اقبال نے ایام طفلی اور جوانی میں کسی بھی مدرسے میں فارسی نہیں پڑھی تھی اور اپنے والد کے گھر میں اردو بولتے تھے لہٰذا انہوں نے فارسی کا انتخاب صرف اس لئے کیا کہ وہ محسوس کرتے تھے کہ ان کے افکار اور مضامین اردو کے سانچے میں نہیں

سماتے تھے اور اس طرح انہوں نے فارسی سے انسیت حاصل کی۔

انہوں نے سعدی اور حافظ کے دیوان اور مثنوی مولانا اور سبک ہندی کے شعراء مثلاً عرفی، نظیری اور غالب دہلوی نیز دیگر شعراء کے کلام کو پڑھ کر فارسی سیکھی۔اگر چہ وہ فارسی ماحول میں نہیں رہے او ر انہوں نے فارسی کی پرورش گاہ میں کبھی زندگی نہیں گزاری تھی لیکن انہوں نے لطیف ترین، دقیق ترین اور نایاب ترین ذہنی مضامین کو اپنی طویل (بعض نہایت اعلیٰ)نظموں کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا اور یہ چیز میری رائے میں اعلیٰ شعری استعداد اور صلاحیت ہے۔اگر آپ ان لوگوں کے اشعار کو دیکھیں جو ایرانی نہیں تھے لیکن انہوں نے فارسی کلام کہا تھااور ان کا اقبال سے موازنہ کریں تو آپ سامنے اقبال کی عظمت واضح تر ہوجائیگی۔

اقبال کے بعض مضامین جن کو انہوں ایک شعر میں بیان کردیا ایسے ہیں کہ اگر انسان چاہے کہ نثر میں بیان کرے تو نہیں کر سکتا اور ہمیں ایک مدت تک زحمت اٹھانی پڑے گی کہ ایک شعر کو جس کو انہوں نے آسانی کے ساتھ بیان کردیا ہے، فارسی نثر میں جو ہماری اپنی زبان بھی ہے، بیان کریں۔

میں جناب ڈاکٹر مجتبوی کا ان اشعار کیلئے جو انہوں نے پڑھے ہیں ممنون ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ آپ اقبال کے کلام کو زندہ کیجئے کیونکہ اقبال کو متعارف کرانے کا بہترین ذریعہ ان کا کلام ہے اور اقبال کو کوئی بھی بیان متعارف نہیں کراسکتا۔

اقبال مانند آفتاب شاعر ہیں اور ان کے بعض فارسی اشعار اپنے عروج پر پہنچے ہوئے ہیں۔ اقبال نے مختلف طرزوں مثلاً ہندی طرز، عراقی طرز اور حتی کہ خراسانی طرز میں بھی شعر کہے ہیں اور نہ صرف یہ کہ صرف شعر کہے بلکہ اچھے شعر کہے ہیں انہوں نے مختلف شعری قالبوں یعنی مثنوی، غزل، قطعہ، دوبیتی اور رباعی کا استعمال کیا ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ قابل تعریف اشعار ہیں اور اعلیٰ مضامین کو

باندھا ہے۔بعض اوقات تو ان کا کلام ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا ہے اور نمایاں حیثیت رکھتا ہے جب کہ اس شخص کو مروجہ فارسی بولنے کی مشق نہیں ہے اور فارسی گھرانے میں پیدا نہیں ہوا اور فارسی کے مرکز میں بھی زندگی نہیں گزاری۔ یہ استعداد ہے لہٰذا اقبال کی ایک صرف ایک شاعر کی حیثیت سے تعریف ان کے حق میں کوتاہی ہے۔

اقبال ایک عظیم مصلح اور حریت پسند شخص ہیں اگرچہ حریت پسندی اور سماجی اصلاح میں اقبال کا رتبہ بہت زیادہ اہم ہے لیکن اقبال کو صرف سماجی مصلح نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اسی برصغیر میں اقبال کے ہم عصروں میں کچھ ہندو اور مسلمان لوگ ہندوستان کے سماجی مصلح مانے جاتے ہیں جن میں سے اکثر کو ہم پہچانتے ہیں اور ان کی تصنیفات موجود ہیں اور ان کی جدوجہد واضح ہے۔

خود مسلمانوں میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مرحوم قائد اعظم (محمد علی جناح) جیسی نمایاں شخصیتیں موجود تھیں جن کی زندگی کے ایام بھی اقبال کی حیات کے مانند تھے۔اور وہ لوگ ایک ہی نسل سے اور ایک ہی عہد سے تعلق رکھتے تھے اور حریت پسندوں ومجاہدوں میں شامل تھے لیکن اقبال ان سب سے بڑے اور اعلیٰ مقام ہیں، اقبال کے کام کی عظمت کا ان میں سے کسی سے بھی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔یعنی زیادہ سے زیادہ اہمیت اور قدر جو مولانا ابوالکلام کے لئے قائل ہیں جو ایک نمایا شخصیت رکھتے ہیں اور حقیقتاً ان کی اہمیت کو کم نہیں سمجھنا چاہئے، یا مولانا محمد علی یا مولانا شوکت علی کے سلسلے میں ہم جس اہمیت کے قائل ہیں، یہ ہے کہ یہ لوگ انتھک مسلمان مجاہد تھے جنہوں نے اپنے ملک سے برطانیہ کو نکالنے کیلئے سال ہا سال کوشش کی اور اس سلسلے میں بہت زیادہ جدوجہد کی۔لیکن اقبال کا مسئلہ صرف ہندوستان کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اسلامی دنیا اور مشرق کا مسئلہ ہے۔ وہ اپنی مثنوی (پس چہ باید کرد ای اقوام مشرق) اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اقبال کی تیز نگاہیں کس طرح اس دنیا کی طرف متوجہ ہیں جو ظلم وستم کا شکار ہے اور ان کی

توجہ اسلامی دنیا کے تمام شعبوں کی جانب ہے۔اقبال کیلئے مسئلہ صرف مسئلہ ہند نہیں ہے لہٰذا اگر اقبال کو ایک اجتماعی مصلح بھی پکاریں تو حقیقت میں ہم اقبال کی پوری شخصیت کو بیان نہیں کرتے اور مجھے وہ لفظ اور عبارت نہیں ملتی جس سے ہم اقبال کی تعریف کر سکیں۔

لہٰذا آپ دیکھئے کہ یہ شخصیت، یہ عظمت اور اس عظیم انسان کی ذات اور اس کے ذہن میں معانی کی گہرائی کہاں اور ہمارے لوگوں کی ان کے متعلق واقفیت کہاں اور حق تو یہ ہے کہ ہم اقبال کی شناخت کے مسئلے سے دور ہیں۔

بہرحال یہ سیمینار بہترین کاموں میں سے ہے جو انجام پائے لیکن اس پر بھی اکتفا نہیں کرنا چاہئے اور میں ثقافت وتعلیمات کے محترم وزیر اور یونیورسٹی سے منسلک بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ملک میں اقبال کے نام پر فاونڈیشن کے قیام اور یونیورسٹیوں، ہالوں اور ثقافتی اداروں کے ناموں کو اقبال کے نام پر رکھنے کی فکر میں رہیں۔اقبال کا تعلق ہم سے، اس قوم سے اور اس ملک سے ہے جس طرح کہ اس غزل میں جو جناب ڈاکٹر مجتبوی نے پڑھی اور آپ نے سنی۔اقبال ایرانی عوام سے اپنے لگاو کو بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں :

چون چراغ لالہ سوزم در خیابان شما
اے جوانان عجم جان من و جان شما

اور آخر میں کہتے ہیں :

می رسد مردی کہ زنجیر غلامان بشکند
دیدہ ام از روزن دیوار زندان شم

اور یہ میری اس بات کی تائید ہے جو اقبال کے ایران نہ آنے کی وجہ کے بیان میں، پہلے عرض کر چکا ہوں۔ وہ اس جگہ کو زنداں سمجھتے ہیں اور قیدیوں سے مخاطب ہو کر بولتے ہیں۔ اقبال کے دیوان میں بہت سی مثالیں ہیں جو اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ وہ ہندوستان سے نا امید ہو چکے ہیں (کم ازکم اپنے زمانے کے ہندوستان سے) اور ایران کی جانب متوجہ ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ مشعل جس کو انہوں نے جلا رکھا ہے ایران میں مزید روشن ہو اور انہیں اس بات کی امید ہے کہ یہاں پر کوئی معجزہ رونما ہو۔ یہ اقبال کا ہم پر حق ہے اور ہمیں چاہئے کہ اس حق کا احترام کریں۔

اب رہی بات اقبال کی شخصیت کی تو اگر ہم اقبال کی شناخت کرنا چاہیں اور اقبال کے پیغام کی عظمت کو جانیں تو ہمیں خواہ مخواہ اقبال کے دور کے برصغیر کو اور اس دور کو پہچاننا پڑے گا جو اقبال کے دور پر ختم ہوتا ہے کیونکہ اس شناخت کے بغیر اقبال کے پیغام کا مفہوم سمجھا نہیں جا سکتا ہے۔ اقبال کے دور میں برصغیر اپنے سخت ترین ایام گزار رہا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اقبال ۱۸۷۷ ء میں پید ہوئے یعنی مسلمانوں کے انقلاب کی انگریزوں کے ہاتھ شکست کے بیس سال بعد۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے ہندوستان اسلامی حکومت اور برصغیر میں اسلام کی حکم فرمائی پر آخری ضرب لگائی۔ ہندوستان میں عظیم بغاوت رونما ہوئی اور شاید یہ بغاوت تقریباً دو تین سال تک جاری رہی۔ اس کا عروج ۱۸۵۷ء کے اوسط میں تھا، انگریزوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اس ضرب کو جو تقریباً ستّر اسّی سال سے ہندوستان پر لگا رہے تھے اچانک فیصلہ کن طور پر لگایا اور اپنے خیال میں وہاں سے اسلام کی جڑوں کو کاٹ دیا۔ یعنی اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی حکومت تھی جس کو انہوں نے طویل عرصے سے ادھر اُدھر سے کمزور بنا دیا تھا۔ اس کے بہادر سرداروں اور عظیم شخصیتوں کو ختم کر دیا تا کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب کی مضبوط جڑوں کو

کمزور کرسکیں۔ اس کے بعد یک بارگی اس تناور اور قدیمی درخت کو جس کی جڑیں پہلے ہی کمزور کر چکے تھے اور جس کے محافظوں کو ختم کر چکے تھے اور وہ اکیلا رہ گیا تھا کاٹ کر ختم کر دیا اور ہندوستان کو برطانوی سلطنت کا جزو بنا لیا۔

۱۸۵۷ عیسوی، ہندوستان میں انگریزوں کی مکمل کامیابی کا سال تھا اور اس کے بعد کہ انگریزوں نے ہندوستان کو با ضابطہ طور پر برطانیہ سے الحاق کر دیا اور اس ملک کا نام سلطنت برطانیہ ہندوستان رکھ لیا، ہندوستان کے کالونی ہونے کا مسئلہ نہیں رہا، بلکہ ہندوستان برطانیہ کے صوبوں میں سے ایک صوبہ بن گیا۔ لہٰذا وہ اپنے مستقبل کی فکر میں پڑ گئے تا کہ اس ملک میں ہر قسم کی بغاوت اور قومی یا مذہبی عظمت کی ترویج کے امکانات کو ختم کر دیں۔ اس کا راستہ یہی تھا کہ مسلمانوں کا مکمل طور پر قلع قمع کریں کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ہندوستان میں ان سے مقابلہ کرنے والے ہیں اور انہوں نے اس کا تجربہ بھی کر لیا تھا۔

مسلمانوں نے انیسویں صدی کی ابتدا بلکہ اس سے بھی پہلے سے ہندوستان میں انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ اٹھارویں صدی کے آخری حصے میں ٹیپو سلطان انگریزوں کے ہاتھوں قتل یا شہید ہوئے لیکن عوام، علماء اور مسلمان قبائل نے انیسوں صدی کی ابتدا سے انگریزوں اور ہندوستان میں ان پٹھوؤں سے جو اس وقت سکھ تھے، جنگ لڑی اور اس بات سے انگریز بخوبی واقف تھے۔ انگریزوں میں سے ان لوگوں نے جو ہندوستان کے مسائل سے واقف تھے کہا تھا کہ ہندوستان میں ہمارے دشمن مسلمان ہیں اور ہمیں ان کا قلع قمع کرنا چاہیے لہٰذا انگریزوں کے کامیابی کے سال یعنی ۱۸۵۷ سے ہی ہندوستان میں مسلمانوں کی سرکوبی کیلئے ایک نہایت ظالمانہ اور سنگدلانہ پروگرام شروع کیا گیا جس کا ذکر ہر جگہ آیا ہے اور یہاں اس کا ذکر طوالت کا سبب بنے گا۔

مختصر یہ کہ مالی اور ثقافتی لحاظ سے ان پر دباو ڈالا جاتا تھا اور اجتماعی شعبوں

میں ان کی بہت تحقیر کی جاتی تھی۔ انگریز اعلان کرتے تھے کہ وہ لوگ جو چاہتے ہیں ملازمت حاصل کریں ان کو مسلمان نہیں ہونا چاہیے۔ جب ایک معمولی سی تنخواہ پر کچھ لوگوں کو ملازم رکھتے تھے، اس وقت مسلمانوں کو ملازم رکھنے سے دریغ کرتے تھے، انہوں نے ہندوستان میں مسجدوں اور اسلامی مدرسوں کو چلانے والے تمام موقوفات کو جو بہت زیادہ تھے، اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ ہندو تاجروں کو ورغلایا کہ مسلمانوں کو بھاری بھاری قرضے دیں تا کہ دیئے جانے والے قرضے کے عوض ان کی جائیدادوں کو ضبط کر سکیں اوران کے زمین سے تعلق اور صاحب خانہ ہونے کے احساس کو بالکل ختم کردیں۔ سالہا سال تک یہ کام جاری رہا اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کے ساتھ ان کے اچھے سلوک کا حصہ تھااور اس سے بدتر یہ تھا کہ ان کو بے دریغ قتل کرتے تھے اور بے دریغ، بلا ثبوت جیل میں ڈال دیتے تھے۔ تمام ان لوگوں کی جن پر انگریزوں کے خلاف اقدامات کرنے کا ذرا سا بھی شک ہوتا سرکوبی کرتے تھے اور ان کو نابود کر دیتے تھے۔ یہ سلسلہ سالہا سال تک جاری رہا۔ ان سخت تکلیف دہ حالات کو دس بیس سال گزرجانے کے بعد (کہ جس کی مثال درحقیقت کسی بھی اسلامی ملک میں مجھے نظر نہیں آئی۔اگر چہ ممکن ہے کہ ہو، لیکن میں نے دنیا کے اُن ممالک کے مختلف علاقوں میں جہاں استعمار موجود رہا ہے مثلاً الجزائر اور افریقی ممالک میں، جہاں بھی نظر ڈالی ہے مجھے یاد نہیں کہ مسلمانوں پر اتنا دباو دیکھا ہو جتنا ہندوستان میں ڈالا گیا ہے) کس طرح لوگوں نے چارہ جوئی کی فکر کی اور انگریزوں سے مقابلے کا سلسلہ مسلمانوں میں ختم نہیں ہوا تھا، اور یہ ایک ایسی چیز ہے جسے ہندوستان کو ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہندوستان میں مسلمان، انگریزوں سے مقابلے میں نمایاں ترین اور بنیادی عنصر تھے اور واقعاً ناشکری ہوگی اگر ہندوستان اپنے اوپر مسلمانوں کے احسانات کو فراموش کردے کیونکہ وہاں پر وجود میں آنے والے عظیم انقلاب اور ہندوستان کی آزادی کی وجہ بننے والی جدوجہد میں مسلمان اپنی حریت پسندی کی خاطر

کبھی بھی خاموش نہیں بیٹھے۔

۱۸۵۷ء کے بعد کے برسوں میں ہر جگہ خاموشی تھی مجاہد مسلمان عناصر مختلف جگہوں پر اپنے کام میں مصروف تھے لیکن ان میں دو قسم کی تحریکیں تھیں، یا تو ثقافتی، سیاسی تھی یا صرف ثقافتی تحریکیں تھیں، مسلمانوں کی یہ دو تحریکیں چارہ جوئی کیلئے جاری تھیں۔ ان دونوں تحریکوں میں سے ایک علماء کی تحریک تھی اور دوسری سر سید احمد خان کی تحریک اور یہ دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل تھیں۔ یہاں پر تفصیل بحث کا موقع نہیں لیکن مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ علماء کی تحریک انگریزوں سے کسی بھی قسم کی مدد لینے کی طرفدار نہ تھی اور سر سید احمد خان کی تحریک اس کے برخلاف انگریزوں سے مصالحت کرنے، ان کے ذرائع سے فائدہ اٹھانے، انگریزوں سے مسکرا کر پیش آنے اور ان سے سمجھوتا کرنے کے حامی تھے۔

یہ دو تحریکیں ایک دوسرے کے مد مقابل تھیں اور افسوس کہ آخر کار دونوں تحریکیں مسلمانوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئیں۔ پہلی تحریک جو علماء کے ہاتھ میں تھی جو تاریخ ہند کی نمایاں شخصیتیں ہیں، یہ مقابلہ کرتے تھے اور ان کی جد وجہد درست تھی لیکن ان ابتدائی چیزوں سے فائدہ اٹھانے سے پرہیز کرتے تھے جو ہندوستان میں اسلامی معاشرے کو جدید ترقیات کے حصول میں مدد کرتی تھیں اور مثال کے طور پر وہ اپنے مدرسوں میں انگریزی زبان کو ہرگز بھی داخل نہیں ہونے دیتے تھے اور شاید اُس وقت ان کو اس کا حق پہنچتا تھا کہ ایسا سوچیں کیونکہ انگریزی زبان کو فارسی زبان کا جو مسلمانوں کی محبوب زبان تھی اور صدیوں تک برصغیر میں سرکاری زبان رہی، جانشین بنادیا تھا اور یہ لوگ انگریزی زبان کو حملہ آور کی زبان سمجھتے تھے۔ لیکن بہرحال انگریزی کا نہ سیکھنا اور نئی ثقافت کی جانب جو آخر کار لوگوں کی زندگی کے شعبوں میں داخل ہورہی تھی، توجہ نہ دینا اس بات کا باعث بنا کہ امت اسلامی اور ملت مسلمان ثقافت، معلومات، عصری قوتوں اور عصری علوم میں جو تمام

معاشروں کے لئے (جو جدید بننے کی جانب بڑھ رہے تھے) موثر اور مفید ہیں پیچھے رہ گئے اور وہ مسلمانوں کو ان علوم سے دور رکھتے تھے۔

لیکن سر سید احمد خان کی تحریک زیادہ خطرناک تھی اور میں چاہتا ہوں کہ یہاں پر سر سید احمد خان کے بارے میں اپنے حتمی فیصلے کو بیان کروں۔ ممکن ہے کہ یہاں پر موجود بھائیوں میں سے بعض اس بات کے قائل نہ ہوں۔ سر سید احمد خان نے یقینی طور پر ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں کوئی اقدام نہیں کیا اور میرا نظریہ ہے کہ اقبال کی تحریک ہندوستان میں، اس کام کے خلاف فریاد تھی جس کا پرچم سر سید احمد خان نے اٹھایا تھا۔ سر سید احمد خان نے انگریزوں سے مصالحت کو بنیاد بنایا اور ان کا بہانہ یہ تھا کہ آخر کار ہمیں مسلمان نسل کو جدید ثقافت میں داخل کرنا چاہیے کیونکہ ہم ان کو ہمیشہ کیلئے جدید تہذیب سے نا واقف اور دور نہیں رکھ سکتے لہٰذا انگریزوں سے مصالحت کرنی چاہیے تاکہ ہم پر سختی نہ کریں اور ہماری عورتیں، بچے اور مرد انگریزوں سے دشمنی کی خاطر اس قدر تکلیف نہ اٹھائیں۔

وہ سادہ لوحی کے ساتھ خیال کرتے تھے کہ انگریزوں سے تواضع، مصالحت اور اظہار عقیدت کے ذریعے ان تجربہ کار خبیث سیاستدانوں کی توجہ کو مبذول کرا سکتے ہیں اور ان کے ایذا رسانیوں کو کم کر سکتے ہیں جبکہ یہ ایک بڑی غلطی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود سر سید احمد خان اور ان کے قریبی لوگ نیز وہ روشن خیال لوگ جو ان کے اردگرد تھے، انگریزوں کے نقصانات سے محفوظ رہے لیکن مسلمانوں کو ہندوستان کے آزاد ہونے یعنی ۱۹٤۷ء تک انگریزوں سے ہمیشہ ہی نقصان پہنچا اور انگریزوں نے اس نوے سال کی مدت میں (۱۸۵۷ء سے ہندوستان کی آزدی کے سال ۱۹٤۷ء تک) مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کر سکتے تھے، کیا۔ لہٰذا انگریزوں کو رام کرنے کیلئے سر سید احمد خان کا حیلہ مسلمانوں کو ذلیل کرنے کا سبب بنا اور اس کے علاوہ اور مسئلہ بھی پیدا ہوا، جو اقبال کی شناخت اور اقبال کے پیغام کے مضمون کو سمجھنے میں موثر ہے اور

وہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں، روشن خیال اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کیلئے جو معاشرتی میدان میں داخل ہوتے تھے آگاہی، علم و معرفت، تعلیم اور عہدہ اہمیت رکھتا تھا لیکن اسلامی تشخص کو ہرگز اہمیت حاصل نہیں تھی اور تدریجی طور پر ہندوستان کے عظیم مسلم معاشرے میں جو دنیا کے عظیم ترین مسلمان معاشروں میں سے تھا (اور اس وقت بھی ایسا کوئی ملک نہیں جس کے مسلمانوں کی تعداد اس زمانے میں برصغیر کے مسلمانوں کے برابر ہو) وہ اسلامی تشخص کا احساس نہیں رکھتے تھے اور اپنے لئے اسلامی شخصیت کے قائل نہیں تھے اور بنیادی طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی امید نہیں تھی۔ چونکہ انہوں نے بہت تکلیفیں برادشت کی تھیں اور ان کی تحقیر کی گئی تھی عام حادثات اور واقعات ان کی ناامیدی، تلخ کلامی اور بدفرجامی کی نشان دہی کرتے تھے اور اب حقارت ہندوستانی مسلمان کی ذات کا جز بن گئی تھی اور ذلت و ناتوانی کا احساس ہندوستانی مسلمان کی شخصیت کے اجزائ میں شمار ہوتا تھا۔

اس زمانے میں جب اقبال احتمالاً ۱۹۰۸ یا ۱۹۰۹ء میں یورپ سے جدید تہذیب سے جھولی بھر کے لوٹے تھے، اس وقت اقبال کے ہم عصر روشن خیال اور ہم نوا (خود ان کے قول کے مطابق) مغربی تہذیب پر نظریں جمائے ہوئے تھے اور ان شخصیتوں کی مانند جن کی طرف جناب مجتبوی نے میرے حوالے سے اشارہ کیا ہے، ایران میں تھیں اپنا اعتبار اس چیز میں دیکھتی تھی کہ اپنے آپ کو مغربی تہذیب سے کچھ زیادہ ملائیں اور مغربی اقدار کے نظام کو اپنے عمل، اپنی روش، لباس، بات چیت اور حتی کہ اپنے افکار اور نظریات میں جلوہ گر کریں۔

اس برطانوی حکومتی مشینری کی نوکری، جو اس وقت ہندوستان پر طاقت کے ساتھ حکومت کر رہی تھی، مسلمانوں کے لئے فخر تھی اور ہندو، جو مسلمانوں سے چند سال پہلے اسی تہذیب اور انہی آداب و رسومات میں داخل ہوگئے تھے اور جنہوں نے انگریزوں سے میل جول کو بہت پہلے ہی اختیار کر لیا تھا اور اسی وجہ سے صنعت،

ثقافت اور انتظامی امور میں کچھ پہلے شامل ہوگئے تھے، ان کا اعتبار تھا۔مسلمانوں کو ہندووں سے بھی ذلت اور زحمت اٹھانی پڑی تھی، حتی کہ سکھ بھی بہت کم اقلیت رکھتے تھے اور وہ قابل فخر چیز جو ہندووں کو اپینشدوں اور اپنے تاریخی اورتہذیبی ماضی سے حاصل تھیں، سکھوں کی زندگی میں نہیں تھیں اور آپ کومعلوم ہے کہ یہ ایک نیا قائم ہونے والا مذہب ہےجس میں اسلام اور ہندوازم نیز دوسری چیزوں کی آمیزش ہے، یہ سکھ بھی مسلمانوں کی تحقیر کرتے تھے اور ان کی توہین کرتے تھے۔ یہ تھی اقبال کے زمانے میں برصغیر ہندوستان میں مسلمانوں کے معاشرے کی صورت حال۔ اسی لاہور کی یونیورسٹی میں جہاں پر اقبال نے تعلیم حاصل کی اور بی۔اے کیا اب ہم وہاں امید بخش اسلامی افکار کے ظہور کی کوئی علامت نہیں دیکھتے۔وہاں پر سب سے بڑی اسلامی کتاب، سر تھامس آرنلڈ کی کتاب ہے یہی ''الدعوۃ الی الاسلام'' نامی کتاب جو عربی زبان میں ہے اور حال ہی میں اس کا فارسی ترجمہ بھی شائع ہوگیا ہے۔ یہ سر تھامس آرنلڈ کے اس دور کے کاموں میں سے ہے جب وہ لاہور کی یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ البتہ یہ ایک اچھی کتاب ہے اور میں اس کو مسترد نہیں کرنا چاہتا لیکن ان کا سب سے بڑا فن یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ اسلامی جہاد کو تدریجی طور پر ایک دوسرے درجے کی چیز بتائیں لہٰذا اس کتاب میں یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ اسلام، دعوت سے پھیلا ہے نہ تلوار سے اور ایک اچھی بات ہے لیکن وہ اس خیال میں اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اسلامی جہاد اس کتاب میں تقریباً ایک ثانوی چیز اور بے فائدہ اور زائد چیز نظر آتا ہے۔

اس کتاب کے اسلامی کام کا ماحصل یہی ہے۔ اس کے علاوہ وہ صاحبان اورخواتین جنہوں نے سر تھامس آرنلڈ کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، جانتے ہیں کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو اسلام کا زبردست حامی سمجھا گیا ہے اور وہ اقبال کے استاد ہیں اور اقبال ان کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ بہتر ہے کہ میں یہاں اس بات کا

ذکر کروں کہ اس عظیم انسان کی ہوشیاری سے علامہ اقبال باوجود اس کے کہ سرتھامس آرنلڈ سے سخت محبت کرتے تھے، ان کے کاموں میں سیاسی افکار سے غفلت نہیں برتتے تھے۔ اس بات کو جناب جاوید اقبال نے اپنے والد کی زندگی میں لکھا ہے، اس کی ایک جلد فارسی میں ترجمہ ہو چکی ہے اور میں نے اسے پڑھا ہے۔ اقبال خود اپنے دوست نذیر نیازی کو جو سرتھامس آرنلڈ کو ایک اسلام شناس جانتے ہیں، خبردار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کونسی اسلام شناسی ؟تم ان کی کتاب ''الدعوۃ الی الاسلام'' کی بات کرتے ہو؟

وہ حکومت برطانیہ کیلئے کام کرتے ہیں اور بعد میں اقبال اپنے دوست سے کہتے ہیں :

جب میں برطانیہ میں تھا تو آرنلڈ نے مجھ سے کہا کہ ایڈورڈ براون کی تاریخ ادبیات کا ترجمہ کروں اور میں نے یہ کام نہیں کرنا چاہا کیونکہ میں نے دیکھا کہ اس کتاب میں سیاسی مقاصد کی آمیزش ہے۔

اب آپ دیکھئے کہ ایڈورڈ براون کی کتاب کے بارے میں اقبال کا نظریہ یہ ہے اور ہمارے ادیبوں کا نظریہ ایڈورڈ براون کے دوستوں اور ان لوگوں کو جو ایڈورڈ براون کی دوستی پر فخر کرتے تھے، دیکھنا چاہیے کہ ان کا نظریہ کیا ہے؟ میں اس وقت ان شخصیتوں کا نام لینا نہیں چاہتا کیونکہ بہرحال ادبی اور ثقافتی شخصیتیں ہیں لیکن سادہ دل، ناآگاہ اور ان سیاسی مقاصد سے بے خبر ہیں مگر اقبال وہ ہوشیار مرد اور ''المومن کیس'' کے مصداق خبیث استعماری سیاست کی ریشہ دوانیوں کو تھامس آرنلڈ اور ایڈور براون کے کاموں میں پہچانتے ہیں اور دیکھتے ہیں اور یہ بات اقبال کی عظمت کی کاملاً نشاندہی کرتی ہے۔ اس زمانے میں برصغیر ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت ایسی تھی کہ حکومت برطانیہ، حکومت برطانیہ کے اصل ایجنٹ اور دوسرے درجے کے ایجنٹ (یا اہمیت کے لحاظ سے زیادہ اعلی درجہ نہ رکھنے والے)زیادہ تر ہندو تھے

اور ہندوستان کی جد وجہد جس کی مشعل کو ابتدائی میں مسلمانوں نے روشن کیا کانگریس پارٹی کے ہاتھوں میں چلی گئی اور وہ بھی متعصب کانگریس پارٹی کے ہاتھوں۔ انڈین کانگریس جس نے آخر کار جد و جہد کے میدان میں عظیم کارنامے انجام بھی دیئے لیکن ان برسوں میں اس پر اسلام سے مخالفت کا تعصب، ہندوں کے جانب جھکاو اور مسلمانوں کی مخالفت کا تعصب حکم فرما تھا اور مسلمانوں میں روشن خیال لوگ مغرب پرست اور مغربی نظام کے والہ و شیدا تھے اور عام معمولی لوگ خوف ناک غربت اور سخت تکلیف دہ زندگی کا شکار تھے اور اپنی معمولی روٹی کو بھی مشکل سے حاصل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس ماحول اور فضا میں کھوئے ہوئے تھے جس کو انگریز زیادہ سے زیادہ مغربیت کی جانب لے جارہے تھے۔ ہندوستان کے اس زمانے کے مسلمان علماء ان ابتدائی شکستوں کے بعد زیادہ تر الگ تھلگ اور حریت پسندی اور تحریک کے نا قابل فہم افکار اور جلووں میں کھوئے ہوئے تھے (سوائے ان علماء کے جو آگے تھے مثلاً مولانا محمد علی جوہر اور ہندوستان کے دیگر نمایاں حیثیت رکھنے والے علماء)۔ عام مسلمان عوام اس قسم کی سخت تکلیف دہ حالت میں زندگی گزار رہے تھے، اسلام سیاسی علیحدگی اور اقتصادی غربت میں تھا اور مسلمان عوام ہندوستانی معاشرے میں ایک طفیلی اور زائد رکن کی حیثیت رکھتے تھے۔

اس تاریک رات میں جس کا کوئی بھی ستارہ نہ تھا، اقبال نے خودی کی مشعل روشن کی۔البتہ ہندوستان کی یہ حالت جو میں نے بیان کی، صرف ہندوستان کیلئے مخصوص نہیں تھی بلکہ تمام اسلامی دنیا میں ایسی ہی حالت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اقبال نے ساری دنیا کی فکر کی۔اس زمانے کے لاہور اور بدبخت برصغیر میں اقبال کی روزمرّہ زندگی نے ان کیلئے ہر چیز کو قابل لمس بنادیا تھا۔ یہ ایسی حالت میں تھا کہ اقبال نے ترکی، ایران اور مثلاً حجاز کا سفر نہیں کیا تھا اور بہت سی دوسری جگہوں کو قریب سے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ اپنے ملک کی صورت حال کو قریب سے دیکھ رہے تھے اور یہی وجہ

تھی کہ انہوں نے ثقافتی، انقلابی اور سیاسی انقلاب برپا کیا۔ پہلا کام جو اقبال کیلئے انجام دینا ضروری تھا یہ کہ ہندوستانی معاشرے کو اسلامی تشخص اور اسلامی امن اور اسلامی شخصیت بلکہ اس کی انسانی شخصیت کی جانب متوجہ کریں اور کہیں کہ تو ہی کیوں اس قدر غرق ہے؟ کیوں اس قدر مجذوب ہے؟ تو نے کیوں اپنے آپ کو اس قدر کھو دیا ہے؟ تو اپنے آپ کو پہچان۔

یہ اقبال کا پہلا مشن ہے۔ آخر وہ اس کے علاوہ کیا کر سکتے تھے؟ کروڑوں افراد کی ایک قوم سے جو سالہا سال تک استعمار کے شکنجوں کے سخت دباؤ میں تھی اور جہاں تک ممکن تھا، اس کی ناک کو رگڑا گیا اور اس سے سمجھنے، جاننے اور امید رکھنے کے امکانات کو چھین لیا گیا تھا، یکبارگی کہا جا سکتا ہے کہ تو ہے اور وہ بھی ہونے کا احساس کر لے؟ کیا ایسا ممکن ہے؟ بہت دشوار کام ہے اور میرا خیال ہے کہ کوئی بھی شخص اقبال کی حد تک اور جس طرح کہ اقبال نے بیان کیا اس بات کو اتنی خوبی کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا تھا۔

اقبال نے ایک فلسفہ کی بنیاد رکھی، خودی کا فلسفہ۔ ہمارے ذہن کے مدنظر فلسفوں کی قسم کا نہیں، خودی کا ایک معاشرتی اور انسانی مفہوم ہے جو فلسفیانہ تعبیرات کے لباس میں اور ایک فلسفیانہ بیان کے لحن میں بیان ہوا ہے۔ اقبال کو اپنی نظم، اپنی غزل اور اپنی مثنوی میں خودی پر ایک اصول اور ایک مفہوم کی حیثیت سے زور دینے کیلئے اس چیز کی ضرورت تھی کہ اس خودی کو فلسفیانہ طور پر بیان کریں۔ اقبال کے مد نظر مفہوم میں خودی کا مطلب شخصیت کا احساس، شخصیت کا سمجھنا، خودنگری، خود اندیشی، خود شناسی اور خود کا ادراک ہے۔ البتہ وہ اس کو ایک فلسفیانہ بیان اور فلسفیانہ مفہوم کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ میں بہت سارے نوٹس لایا ہوں تا کہ اگر ممکن ہو تو ان میں سے بعض کو پڑھوں۔ اگرچہ یہ جلسہ طویل ہو گیا ہے لیکن میری درخواست ہے کہ آپ تحمل سے کام لیں۔

میرے خیال میں خودی کا مسئلہ اقبال کے ذہن میں پہلے ایک انقلابی فکر کی شکل میں آتا ہے اور بعد میں انہوں نے اس فکر کو فلسفیانہ بنانے کی کوشش کی ہے اور خودی وہی چیز ہے جس کی ہندوستان میں ضرورت تھی اور مجموعی نقطہ نگاہ سے اسلامی دنیا میں اس کی ضرورت تھی یعنی ملل اسلامی اگر چہ اسلامی نظام کی حامل تھیں لیکن انہوں نے اس چیز کو بالکل فراموش کر دیا تھا اور مکمل طور پر فریب کھا کر اقدار کے ایک غیر ملکی نظام کے والہ و شیدا اور معتقد ہو گئے تھے اور ضروری تھا کہ وہ اپنی جانب لوٹیں یعنی اسلامی اقدار کے نظام کی جانب لوٹیں، یہ وہی مفہوم ہے جس کے لئے اقبال کو شش کرتے ہیں۔ لیکن ایسے سماجی مفہوم کا ایک ایسی شکل میں بیان کرنا کہ ذہنوں میں جا گزیں ہو سکے فلسفیانہ بیان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا وہ اس مفہوم کو فلسفیانہ بیان کی شکل دیتے ہیں۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں ان عبارتوں کو پڑھوں جو میں نے نوٹ کی ہیں۔

اقبال کے ذہن میں ''خودی'' کا خیال ابتداء میں ایک معاشرتی اور انقلابی فکر کی شکل میں آیا اور تدریجاً اقوام مشرق (خصوصاً مسلمانوں) میں شخصیت کے انحطاط اور زوال اور مصیبت کی عظمت کا مشاہدہ اور ان کے علل و اسباب اور علاج کی شناخت نے اس فکر کو ان کے وجود میں مستحکم اور نا قابل خلل بنا دیا اور اس کے بعد ان کی اس فکر کو پیش کرنے کے طریقے کی جستجو میں ایک فلسفیانہ اور ذہنی بنیاد ملی۔ یہ بنیاد خودی کے مفہوم کا تصور ہے عام شکل میں (اس چیز کی مانند جس کو ہمارے فلسفی وجود کی مفہوم کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں یعنی وہ عام مفہوم جو سبھی میں ہے اور اس کو فلسفیانہ طور پر بیان کیا جاسکتا ہے) البتہ وجود ''خودی'' سے مختلف چیز ہے اور خودی کا مطلب وجود بتانا (میں نے دیکھا ہے اقبال کے اشعار پر حاشیہ لکھنے والوں میں سے بعض نے لکھا ہے) میرے خیال میں ایک بڑی غلطی ہے اور وہ وحدت در کثرت اور کثرت در وحدت جس کی اقبال رموز بے خودی میں کئی بار تکرار کرتے ہیں، ملا صدرا

اور دیگر فلسفیوں کے وحدت در کثرت اور کثرت در وحدت کے نظریئے سے مختلف ہے۔ یہ کچھ اور چیز ہے اور مجموعی طور پر اقبال کے مدنظر مفاہیم سو فیصد انسانی اور اجتماعی مفاہیم ہیں (البتہ میں جو عرض کر رہا ہوں اجتماعی، اس کا مطلب فرد کے بارے میں بحث نہ کرنا، نہیں ہے کیونکہ خودی کی بنیاد فرد میں مستحکم ہوتی ہے لیکن خود فرد میں خودی کی خودیت اور فرد میں خودی کی شخصیت کا استحکام بھی اسلام کے اجتماعی مفاہیم میں سے ایک ہے اور جب تک خودی کی وہ شخصیت مستحکم نہ ہو، حقیقی اور مستحکم شکل میں اجتماع اور معاشرہ وجود میں نہیں آتا)۔

بہر حال خودی کے معنی وجودی سے مختلف ہیں۔ وہ اول خودی کے مفہوم کی عمومیت کے بارے میں عرفاء کی زبان میں اور عرفاء کی مانند تعبیرات میں گفتگو کرتے ہیں۔ عالم ہستی کو جلوہ گری خودی کے اثرات میں سے ہے۔ عینیات عالم میں سے ہر ایک خودی کے مفہوم کے ایک جلوے کی نشان دہی کرتی ہے (البتہ ان چیزوں کو اقبال نے اکثر نظموں کے عنوانات میں ذکر کیا ہے جس کو میں نے دوسرے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ بعض تعبیرات ایسی ہیں کہ جن کو خود انہوں نے اپنے کلام میں استعمال کیا ہے اور ان کا کلام ان تعبیرات سے بہت بہتر ہے) افکار کا سر چشمہ بھی خودی سے مختلف جلووں میں خود آگہی ہے۔ ہر مخلوق میں خودی کا اثبات اس کے علاوہ کا بھی اثبات ہے۔ جب کسی انسان میں خودی کا اثبات ہوتا ہے، یہ خودبخود غیر کا بھی اثبات ہے لہٰذا خودی موجود ہے اور اس کا غیر بھی گویا کہ ساری دنیا میں شامل ہے اور ممکن ہے) خودی دشمنی کا بھی سبب بنتی ہے اور درحقیقت خودی اپنی ضد سے برسر پیکار ہوتی ہے۔ یہ کشمکش دنیا میں دائمی پیکار کو جنم دیتی ہے۔ خودی زیادہ تر صالح کے انتخاب اور زیادہ شائستہ کی بقاء کی حامل بھی ہے اور اکثر ایک بالا تر و برتر خود کیلئے ہزاروں خود فدا ہوجاتے ہیں۔ خودی کا مفہوم ایک مشکوک مفہوم ہے۔ اس میں قوت اور ضعف ہے خودی کی قوت اور ضعف دنیا کی ہر مخلوق میں اس مخلوق کے استحکام کے اندازے کا

تعین کرتی ہے اور اس طرح وہ قطرہ، مے، جام، ساقی، کوہ، صحرا، موج، دریا، نور، چشم، سبزہ، شمع خاموش، شمع گدازاں، نگیں، زمین، چاند، خورشید اور درخت کو مثال کے طور پر ذکر کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں خودی کی مقدار کا اندازہ لگاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک قطرے میں خودی کی ایک خاص مقدار ہے، نہر میں ایک مقدار اور اس نگینے میں جس پر نقوش کھودے جا سکتے ہیں اور اس پتھر میں جس پر کھدائی نہیں کی جاسکتی، خودی کی ایک خاص مقدار موجود ہے۔ یہ ایک مشکک مفہوم ہے جو قابل رشک ہے اور انسانی افراد اور اشیائے عالم میں مختلف مقدار میں موجود ہے۔ وہ بعد میں نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

چون خودی آرد بہم نیز وی زیست
می گشاید قلزمی از جوی زیست

بعد میں وہ آرزومند ہونے اور مدعا رکھنے کے مسئلے کو پیش کرتے ہیں اور یہ بالکل وہی چیز ہے جو اس زمانے کی اسلامی دنیا میں نہیں تھی یعنی مسلمانوں کو کسی چیز کا دعوی نہیں تھا، ان کی کوئی بڑی آرزو نہیں تھی اور ان کی آرزو زندگی کی معمولی اور حقیر آرزوئیں تھیں)وہ کہتے ہیں ایک انسان کی زندگی کا دارومدار آرزو پر ہے ایک شخص کی خودی یہ ہے کہ وہ آرزومند ہو اور اس آرزو کی جستجو میں بڑھے(اور مجھے یہ جملہ یاد آ گیا، انما الحیوۃ عقیدہ و جہاد۔

وہ اسی مضمون اور اسی مفہوم کی بہت وسیع اور گہرے نیز لطیف انداز میں بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں: کسی چیز کا چاہنا اور اس کا حاصل کرنے کیلئے کوشش کرنا ہی مدعا ہے ورنہ زندگی موت میں تبدیل ہو جائے گی۔ آرزو، جان، جہان اور صدف فطرت کا گوہر ہے، وہ دل جو آرزو پیدا نہ کر سکے پر شکستہ اور بے پرواز ہے اور یہ آرزو

ہے جو خودی کو استحکام عطا کرتی ہے اور طوفانی سمندر کی مانند موجوں کو جنم دیتی ہے۔ لذت دیدار ہے جو دیدارِ دوست کو صورت عطا کرتی ہے، شوخی رفتار ہے جو کبک کو پاوں عطا کرتی ہے، نوا کی سعی وکوشش ہے جو بلبل کو منقار عطا کرتی ہے۔ بانسری نواز کے ہاتھ اور ہونٹوں میں بانسری ہے جو زندگی پاتی ہے ورنہ نیستاں میں کوئی چیز بھی عملی طور پر نہیں تھی۔ علم وتمدن، نظم وآداب اور رسومات نیز اصول سبھی ان آرزوں سے وجود میں آئے ہیں جن کیلئے کوشش کی گئی ہے اور وہ بعد میں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں :

ماز تخلیق مقاصد زندہ ایم
از شعاع آرزو تابندہ ایم

مدعا سازی آزو سازی اور ہدف سازی یا ایک اور شعر میں اس موضوع کے بارے میں کہتے ہیں :

گرم خون آدم ز داغ آرزو
آتش، این خاک از چراغ آرزو

اور بعد میں انسانی معاشرے، انسان اور خودی کے استحکام کیلئے عشق ومحبت کو ضروری سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں، محبت کے بغیر فرد اور معاشرے میں خودی کا استحکام نہیں حاصل ہوسکتا اور ضروری ہے کہ ملت مسلمان اور وہ انسان جو چاہتے ہیں اپنی خودی کو مضبوط بنائیں، محبت اور عشق رکھتے ہوں اور ان کا دل اس آگ میں پگھلے۔ اس کے بعد دلچسپ ہے کہ خود ہی امت اسلامیہ کے عشق کے لئے ایک نقطہ پاتے ہیں اور وہ ہے پیغمبر اکرم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عشق۔ یہی وجہ ہے کہ انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ بیدار اور ہوشیار شخصیت اسلامی دنیا کے اتحاد اور اسلامی دنیا کو تحریک میں لانے کے مسئلے کو کس قدر اچھی طرح سمجھتے ہیں

نقطہ نوری کہ نام او خودی است
زیر خاک ما شرار زندگی است

از محبت می شود پاینده تر
زنده تر، سو زنده تر، تابنده تر

از محبت اشتعال جو هرش
ارتقای ممکنات مضمرش

فطرت او آتش اندوزد ز عشق
عالم افروزی بیاموزد ز عشق

در جهاں هم صلح و هم پیکار عشق
آبِ حیوان، تیغ جوهر دار عشق

عاشقی آموز و محبوبی طلب
چشم نوحی، قلب ایوبی طلب

کیمیا پیدا کن از مشت گلی
بوسه زن بر آستان کاملی

اس کے بعد کہتے ہیں، اب وہ معشوق ومحبوب جس سے مسلمان کو لگاؤ رکھنا چاہیے اور جس کا عاشق ہونا چاہیے، کون سی ہستی ہے!

بست معشوقی نهان اندر دلت
چشم اگر داری بیا بنمایمت

عاشقان او ز وبان خوب تر
خوشتر و زیبا تر و محبوب تر

دل ز عشق او توانا می شود
خاک، بمدوش ثریا می شود

خاک نجد از فیض او چالاک شد
آمد اندر وجد و بر افلاک شد

در دل مسلم مقام مصطفیؐ است
آبروی ما ز نام مصطفیؐ است

طور موجی از غبار خانہ اش
کعبہ را بیت الحرام کا شانہ اش

بوریا ممنون خواب راحتش
تاج کسری زیر پائ امتش

در شبستان حرا، خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

ماند شبہا چشم او محروم نوم
تا بہ تخت خسروی خوابید قوم

اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کچھ تشریح کرتے ہیں اور ان کے اوصاف کو بیان کرتے ہیں۔ البتہ اقبال کے پورے دیوان میں اور ان کے سارے کلام میں انسان پیغمبر سے عشق کو دیکھتا ہے اور صرف اسی جگہ کیلئے مخصوص نہیں ہے اور اس بات کا ذکر مناسب ہوگا کہ ایک کتاب جسے پاکستان کے ایک ہم عصر محقق نے اقبال کے بارے میں لکھا ہے اور اس متین و موقر کتاب کا نام ''اقبال در راہ مولوی'' ہے یہ کتاب مجھے اپنے حالیہ دور میں ملی اور میں نے اس سے استفادہ کیا ہے، میں نے دیکھا ہے کہ اس میں لکھا ہے:

جب بھی کوئی نظم یا شعر جس میں پیغمبر اکرم ﷺ کا نام ہوتا اور اقبال کو سنایا جاتا تو اقبال کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوجاتے درحقیقت وہ خود پیغمبر کے عاشق اکبر تھے۔

حقیقت میں اقبال نے ایک اچھے نکتہ پر انگلی رکھی ہے۔ دنیائے اسلام، پیغمبر ﷺ سے زیادہ محبوب اور مقبول عام کون سی ہستی کو تلاش کرسکتی ہے؟ اور یہ چیز دنیائے اسلام کی تمام محبتوں کو مرکزیت عطا کرتی ہے اور اس سلسلے میں کچھ گفتگو کے بعد حاتم طائی کی بیٹی کی کہانی کا ذکر کرتے ہیں کہ ایک جنگ میں حاتم طائی کی بیٹی قید ہوکر آئی اور اُسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب اس لڑکی کے سر کو عریاں دیکھا تو پیغمبر اکرم ﷺ نے اسے بڑے اور اچھے خاندان کی لڑکی عریانیت کو پسند نہیں کیا اور اپنی عبا اٹھا کر اس لڑکی پر ڈال دی تا کہ وہ سرنگوں اور شرمسار نہ ہو اور اس کے بعد کہتے ہیں:

ما از آن خاتون طی عریان تریم
پیش اقوام جہان بی چادریم

روز محشر اعتبار ماست او
در جہان ہم پردہ دار ما است او

ما کہ از قید وطن بیگانہ ایم
چون نگہ نور دو چشمیم و دیکیم

از حجاز و مصر و ایرانیم ما
شبنم یک صبح خندانیم ما

مست چشم ساقی بطحا ستیم
در جہان مثل می و مینا ستیم

چون گل صد برگ ما را بو یکی است
اوست جان این نظام و او یکی است

وہ ''اسرار خودی''میں کوشش کرتے ہیں کہ احساس خودی یعنی انسانی تشخص کے احساس کو مسلمان فرد اور معاشرے میں زندہ کریں۔

اسرار خودی کا ایک اور باب یہ ہے کہ خودی سوال سے کمزور پڑ جاتی ہے یعنی جب ایک فرد یا ایک قوم نیاز مندی کا ہاتھ پھیلاتی ہے تو اس فرد یا قوم کی خودی کمزور ہو جاتی ہے اور اپنے استحکام کو کھو بیٹھتی ہے اس سلسلے میں دلچسپ اور پر مغز بحثیں اور بھی ہیں۔ خودی کے بعد، بے خودی کا فلسفہ ہے یعنی جب ہم ''خود''اور ایک انسان کی شخصیت کی تقویت کے بارے میں بحث کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں

ہونا چاہیے کہ انسان ایک دوسرے سے جدا ہو کر اپنے ارد گرد دیوار کھڑی کر لیں اور خود زندگی گزاریں بلکہ ان تمام خود کو چاہیے کہ ایک معاشرے کے مجموعے میں خود ہو جائیں یعنی فرد کو معاشرے سے ارتباط حاصل کرنا چاہیے۔ یہ رموز بے خودی ہے اور رموز بے خودی نامی کتاب اقبال کی دوسری کتاب ہے اور اسرار خودی کے بعد کہی گئی اور شائع ہوئی ہے خود اسلامی نظام کے بارے میں اقبال کے خیال کی نشاندہی کرتی ہے اور ایک اسلامی نظام کے قیام کیلئے اقبال کے افکار ہر جگہ موجود ہیں لیکن رموز بے خودی، میں ہر جگہ سے زیادہ نظر آتے ہیں اور مجموعی طور پر وہ مسائل جن کا ذکر رموز بے خودی میں موجود ہے اہم اور دلچسپ موضوعات ہیں اور ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل کیلئے ان پر توجہ ضروری ہے۔

آج جب ہم اقبال کے افکار کو رموز بے خودی کے مضامین میں دیکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہمارے اسلامی معاشرے پر حکم فرما ہے۔ اسلام کی ترویج میں امت توحیدی کی ذمہ داری اقبال کے پر جوش ترین نظریات میں سے ایک ہے اور ان کے خیال میں مسلمانوں اور امت اسلامیہ کو جنہیں اسلام کی ترویج کرنی چاہیے، چین سے نہیں بیٹھنا چاہیے تاکہ اس کام کو انجام دے سکیں۔ مناسب ہوگا کہ اس سلسلے میں اس کے چند اشعار جو بہت دلچسپ ہیں آپ کو پڑھ کر سناؤں:

وہ کہتے ہیں اسلامی معاشرے کی تشکیل اور دنیا کیلئے اسلامی امت کا وجود میں آنا ایک آسان کام نہیں تھا۔ دنیا بہت تکلیفیں اٹھانے اور تاریخ بہت سے تجربات کرنے کے بعد امت توحیدی کو پا سکی ہے اور توحیدی نظریہ اور اسلامی فکر کی حامل امت وجود میں آسکی ہے:

این کہن پیکر کہ عالم نام اوست
ز امتزاج امہات اندام اوست

صد نیستان کاشت تا یک نالہ رست
صد چمن خون کرد تا یک لالہ رست

نقشہا آورد و افگند و شکست
تا بہ لوح زندگی نقش تو بست

نالہ ھا در کشت جان کا ریدہ است
نا توای یک اذان بالیدہ است

مدتی پیکار با احرار داشت
با خداوندان باطل کار داشت

تخم ایمان آخر اندر گل نشاند
با زبانت کلمہ ی توحید خواند

نقطہ ادوار عالم لا الہ
انتہای کار عالم لا الہ

چرخ را از زور او گردندگی
مہر را تابندگی رخشندگی

بحر گوہر آفرید از تاب او
موج در دریا طپید از تاب او

شعلہ در رگہائ تاک از سوز او
خاک مینا تابناک از سوز او

نغمہ ہایش خفتہ در ساز وجود
جویدت ای زخمہ ور ساز وجود

صدنواداری چو خون در تن روان
خیز و مضرابی بہ تار او رسان

زاں کہ در تکبیر راز بود توست
حفظ و نشر لا الہ مقصودتست

تا نخیزد بانگ حق از عالمی
گر مسلمانی نیا ساہی دمی

می ندانی آیہ ام الکتاب
امت عادل ترا آمد خطاب

آب و تاب چہرہ ی ایام تو
در جہان شاید علی الاقوام تو

نکتہ سنجان را صدای عام دہ
از علوم امی ای پیغام دہ

امی ای، پاک از ہوا گفتار او
شرح رمز ''ماغوی'' گفتار او

از قبای لالہ ھای ایں چمن
پاک شست آلودگیہای کہن

اس کے بعد جب وہ اسلامی نظریئے کی آفاقیت کو بیان کرتے ہیں تو بلا شبہ ان کی کتاب میں شاید سو بار سے زیادہ اسلام اور مسلمان کی آفاقیت اور اس کے عالمی وطن کا ذکر آیا ہے۔تو یہاں پر بھی کہتے ہیں :اے امتِ توحید پرچم تیرے ہاتھ میں ہے، تجھے حرکت کرنی چاہیے اور اسے دنیا تک پہنچانا چاہیے۔ بعد میں وہ کہتے ہیں کہ یہ دلفریب جدید بت جسے فرنگیوں نے پیدا کیا ہے، اس جدید بت کو توڑ دو اور خود ہی بتاتے ہیں کہ یہ جدید بت کیا ہیں :

ای کہ میداری کتابش در بغل
تیز تر نہ پا بمیدان عمل

فکر انسان بت پرستی، بت گری
ہر زمان در جستجوی پیکری

باز طرح آزری انداختہ است
تازہ تر، پروردگاری ساختہ است

کاید از خون ریختن اندر طرب
نام او، رنگ است و ہم ملک و نسب

آدمیت کشتہ شد چون گوسفند
پیش پای این بت نا ارجمند

ای کہ خودر دستی زمینای خلیل
گرمی خونت زمجھا ی خلیل

بر سر این باطل حق پیرہن
تیغ لا موجود لا ھو بزن

جلوہ در تاریکی ایام کن
آنچہ بر تو کامل آمد، عام کن

یہ ہے اسلام کی نشر و اشاعت اور قومیت اور وطن کی سرحدوں کو ختم کرنے کے سلسلے میں اقبال کا نظریہ۔ رموز بےخودی میں ایک مضمون جس پر وہ زور دیتے ہیں فرد کے اجتماع سے متصل ہونے اور فرد کے اجتماع میں حل اور جذب ہوجانے کی ضرورت ہے۔

وہ نبوت کو امت کی تشکیل کی اصل بنیاد جانتے ہیں اور کہتے ہیں ایسا نہیں

کہ جب افراد ایک جگہ جمع ہوجائیں تو ایک قوم یا ملت وجود میں آجاتی ہے بلکہ ایک فکر کی ضرورت ہے جو ملت یا قومیت کے تانے بانے کو یکجا کرے چنانچہ بہترین اور بنیادی ترین فکر نبوت کی فکر ہے، جس کو خدا کے پیغمبروں نے آکر پیش کیا۔ تشکیل ملت کیلئے یہ بہترین طریقہ ہے کیونکہ یہ اجتماع کو فکر عطا کرتی ہے، ایمان عطا کرتی ہے اور اتحاد عطا کرتی ہے نیز تربیت و کمال بخشتی ہے۔

ایک اور مضمون جس پر زور دیتے ہیں خداوندان تخت و محراب کی بندگی کی نفی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے اشعار کا ایک حصہ بہت دلچسپ ہے، آپ بھی سنیے:

بود انسان در جہان انسان پرست
ناقص و نابود مند و زیر دست

سطوت کسری و قیصر رہزنش
بند با در دست و پا و گردنش

کاہن و پاپا و سلطان و امیر
بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر

صاحب اورنگ و ہم پیر کنشت
باج برکشت خراب او نوشت

در کلیسا اسقف رضوان فروش
بہر این صید زبون دامی بدوش

برہمن گل از خیابانش ببرد
خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد

از غلامی فطرت اور دون شدہ
نغمہ ما اندر نئے او خون شدہ

نا امینی حق بہ حق داران سپرد
بندگان را مسند خاقان سپرد

یہ اشعار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی تشکیل، انسانوں کے مابین مساوات قائم کرنے اور ''انّ اکرمکم عند اللہ اتقکم ''اور اخوت اسلامی کے بارے میں ہیں۔ خود انہوں نے جس طرح موضوعات اور عنوانات کا ذکر کیا ہے، بہت زیادہ ہیں، اور چونکہ میری گفتگو تفصیلی ہوگئی ہے، مناسب نہیں ہوگا کہ اس سے زیادہ تفصیلی گفتگو کروں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ درحقیقت کونسے حصے کا انتخاب کروں اور اس کے بارے میں گفتگو کروں کیونکہ انہوں نے اس قدر زیادہ دلچسپ اور اچھے موضوعات پر گفتگو کی ہے کہ انسان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کو فوقیت دی جائے اور بیان کیا جائے اور ان سب باتوں کے بیان کیلئے، ہمارے ملک میں اقبال کے کلام کے شائع کرنے کے سوا، یہ کام کسی اور طریقے سے ممکن نہیں۔ یہ کام ایسا ہے کہ جسے یہاں، پاکستان اور افغانستان میں بھی ہونا چاہیے نیز ہر اس جگہ پر جہاں لوگ فارسی سمجھتے ہیں یا ممکن ہے سمجھ سکیں اقبال کے کلام کو جس میں فارسی کا کلام ہے شائع ہونا چاہیے۔

البتہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ اقبال کے پندرہ ہزار شعروں میں سے نو ہزار فارسی میں ہیں اور ان کا اردو کلام فارسی سے بہت کم ہے۔ ان کے بہترین اشعار

اور کم از کم معنی کے لحاظ سے ان کا اہم ترین کلام وہی ہے جو انہوں نے فارسی میں کہا ہے۔ وہ کلیات جو شاید بیس سال قبل یہاں پر شائع ہوئے اس پر مزید کام اور محنت کی ضرورت ہے۔

میں جب سے اقبال کے کلام سے آشنا ہوا ہوں، دیکھتا تھا کہ اس کلام کی اچھی طرح وضاحت کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ کافی وضاحت نہیں ہے اور مجھے اس بات کا دکھ ہوتا تھا۔ حقیقت میں اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ کام انجام پائے اور کچھ لوگ ان لوگوں کے لئے جن کی زبان فارسی ہے علامہ اقبال کے مدنظر مضامین اور مفاہیم کی تشریح کریں۔

آج علامہ اقبال کے بہت سے پیغامات ہم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں سے بعض اس دنیا والوں کیلئے ہیں جو ابھی تک ہمارے راستے پر نہیں آئے اور اس پیغام کو جس کو ہم سمجھ گئے ہیں انہوں نے نہیں سمجھا ہے۔

اقبال کے ''خودی'' کے پیغام کو ہماری قوم نے میدان عمل میں اور حقیقت کی دنیا میں عملی جامہ پہنایا لہٰذا ہماری قوم کیلئے ضرورت نہیں کہ اسے خودی کا مشورہ دیا جائے۔ ہم ایرانی عوام آج مکمل طور پر محسوس کرتے ہیں کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہیں، اپنی ثقافت اور اپنی چیزوں پر بھروسہ کرتے ہیں اور اس تمدن پر جس کو آئیڈیالوجی اور فکر کی بنیاد پر استوار کرسکتے ہیں۔ البتہ ماضی میں مادی زندگی اور زندگی گزارنے کے لحاظ سے ہماری تربیت دوسروں کے سہارے پر کی گئی، لیکن ہم تدریجی طور پر اپنے خیموں سے ان غیر ملکی رسیوں کو بھی کاٹ پھینکیں گے اور اپنی ہی رسیوں کا استعمال کریں گے اور ہمیں امید ہے کہ اس کام میں کامیاب ہونگے۔

مسلمان اقوام کو اس ''خودی'' کو سمجھنے کی ضرورت ہے، خاص طور پر مسلمان شخصیتوں کو خواہ وہ سیاسی شخصیتیں ہوں یا ثقافتی۔ انہیں ضرورت ہے کہ اقبال کے پیغام کو سمجھیں اور جان لیں کہ اسلام اپنی ذات میں اور اپنی اصلیت میں انسانی

معاشروں کو چلانے کی اعلی ترین بنیادوں کا حامل ہے اور دوسروں کا محتاج نہیں ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ دوسری ثقافتوں کیلئے دروازہ بند کردیں اور ان کو اپنی طرف جذب نہ کریں۔ جی ہاں ہمیں جذب کرنا چاہیے لیکن ایک زندہ جسم کی مانند جو ضروری عناصر کو اپنے لیے جذب کرتا ہے نہ کہ اس بے ہوش اور مردہ جسم کی مانند جس میں جو چاہتے ہیں، داخل کر دیتے ہیں۔

ہم میں جذب کرنے کی توانائی ہے اور دوسری ثقافتوں اور دوسروں کے افکار سے خواہ غیر ملکی ہوں اس چیز کو جو ہم سے تناسب رکھتی ہو، اور ہمارے لیے مفید ہو اخذ کرتے ہیں اور جذب کرتے ہیں لیکن جس طرح کہ اقبال بار بار کہتے ہیں علم و فکر کو مغرب سے سیکھا جا سکتا ہے لیکن سوز و زندگی کو نہیں۔

خرد آموختم از درس حکیمان فرنگ
سوز اندوختم از صحبت صاحب نظراں

ایسی کوئی چیز (یعنی سوز و زندگی) مغرب کی تعلیم اور مغربی مدنیت کے تمدن میں نہیں ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کا اقبال نے سب سے پہلے ایک علمبردار کی شکل میں احساس اور اعلان کیا ہے۔

مغربی تمدن اور مادی مذہب (مادی شہری زندگی) انسان کیلئے ضروری روح اور معنی سے خالی ہے لہٰذا ہم مغربی ثقافت سے اس چیز کو لیتے ہیں جو ہمارے لیے ضروری ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں اور ہماری عوام میں خودی اور اسلامی شخصیت کا احساس کمال کی حد تک موجود ہے اور ہماری نہ شرقی اور نہ غربی ولا شرقیہ ولا غربیہ کی پالیسی بالکل وہی چیز ہے کہ جس کی بات اقبال کرتے تھے۔ ہمارا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن سے عشق اور قرآن سیکھنے کے لیے ہماری نصیحت اور یہ بات کہ انقلابوں اور مقاصد کی بنیاد اسلامی اور قرآنی ہونی چاہیے بالکل وہی چیز ہے

کہ جس کا مشورہ اقبال دیتے تھے لیکن اُس وقت اُن باتوں کو سننے والا کوئی نہیں تھا۔

اُن دنوں اقبال کی زبان اور اقبال کے پیغام کو بہت سے لوگ نہیں سمجھتے تھے۔اقبال کی کتابیں اور نظمیں اس شکایت سے بھری ہوئی ہیں کہ میری بات کونہیں سمجھتے اور نہیں جانتے اور نگاہیں دوسری جگہوں اور مغرب کی جانب ہیں۔ شاید اس رموز بے خودی کے مقدمے میں ہے کہ وہ یہ شکایت کرتے ہیں اور امت اسلام کو مخاطب کرکے اور بقول خود ان کے پیش نہ حضور ملت اسلامیہ کہتے ہیں

ای ترا حق خاتم اقوام کرد
بر تو ہر آغاز را انجام کرد

ای مثال انبیائ پاکان تو
ہمگر دلہا جگر چاکان تو

ای نظر بر حسن ترسا زادہ ای
ای ز راہ کعبہ دور افتادہ ای

ای فلک مشت غبارک کوی تو
ای تماشا گاہ عالم روی تو

ہمچو موج ، آتش نہ پامی روی
تو کجا بہر تماشا می روی

رمز سوز آموز از پروانہ ای
در شرر تعمیر کن کاشانہ ای

طرح عشق انداز اندر جان خویش
تازی کن با مصطفی پیمان خویش

خاطرم از صحبت ترسا گرفت
تا نقاب روی تو بالا گرفت

ہم نوا از جلوہ اغیار گفت
داستان گیسو و رخسار گفت

بر در ساقی جبین فرسود او
قصہ ی مغ زادگان پیمود او

من شہید تیغ ابروی تو ام
خاکم و آسودہ ی کوی توام

از ستایش گستری بالا ترم
پیش ہر دیوی فرونایید سرم

یعنی اے امت اسلام! میں جو اس عاشقانہ طور پر تیری مدح سرائی کرر ہا ہوں، اس لیےنہیں ہے کہ میں مداح ہوں:

از سخن آئینہ سازم کردہ اند
از سکندر بی نیازم کردہ اند

بار احسان بر نتابد گردنم
در گلستان غنچہ گردد دامنم

سخت کوشم مثل خنجر در جہان
آب خود می گیرم از سنگ گران

یہاں پر وہ اپنی بے نیازی کی بات کرتے ہیں اور اس وقت اقبال اس بے نیازی کے ساتھ کہ وہ دنیا کے سامنے سرنہیں جھکاتے امت اسلامیہ کے سامنے دو زانو بیٹھ کر التماس کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو پہچان، اپنے آپ کی جانب لوٹ اور قرآن کی بات سن:

بر درت جانم نیاز آوردہ است
ہدیہ ی سوز و گداز آوردہ است

ز آسمان آبگون یم می چکد
بردل گرمم دما دم می چکد

من ز جو باریک تر می سازمش
تا بصحن گلشت اندازمش

اگر ہم آخر تک ان کی بحثوں اور اشعار کو پڑھنا چاہیں تو بحث کی شکل ہی بدل جائے گی اور کافی زیادہ وقت لگے گا۔ اور یہ تو ہمارے اس عظیم اقبال کی شخصیت

کا ایک خلاصہ ہے جو بلا شک مشرق کا بلند ستارہ ہے اور بے جا نہ ہوگا اگر ہم اقبال کو اس لفظ کے حتمی معنی میں مشرق کا بلند ستارہ پکاریں۔ بہر حال ہمیں امید ہے کہ ہم اقبال کا حق ادا کرسکیں اور گزشتہ چالیس پچاس برس کے دوران اقبال کی شناخت میں اپنی قوم کی تاخیر کا ازالہ کرسکیں۔

اقبال کی وفات گویا ۱۳۱۸ہجری شمسی مطابق ۱۹۳۸ء میں ہوئی اور میرے خیال میں اس وقت سے اب تک یعنی اقبال کی وفات کے بعد سے آج تک کا جو ایک طویل عرصہ ہے، اگر چہ اقبال کے نام سے سیمینار ہوئے، کتابیں لکھی گئیں اور تقریریں ہوئیں لیکن سب بیگانہ وار اور دور سے تھیں اور ہماری قوم اقبال کی حقیقت، اقبال کی روح اور قبال کے عشق سے بے خبر رہی ہے اور اس عیب کی ان شائ اللہ تلافی ہونی چاہیے اور وہ لوگ جو اس کام سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً شعرائ، مقررین، مصنفین، جرائد اور متعلقہ سرکاری ادارے وزارت مثلاً ثقافت و اعلی تعلیم، وزارت تعلیم و تربیت اور وزارت ارشاد اسلامی، ہر ایک ان شائ اللہ اپنی اپنی باری سے کوشش کریں کہ اقبال کو اس طرح جیسا کہ ان کا حق ہے، زندہ کریں اور انکے کلام کو کورس کی کتابوں اور دیگر کتابوں میں شامل کریں اور پیش کریں۔ ان کی کتابوں اور اشعار کو الگ الگ شائع کریں، اسرار خودی کو علیحدہ، رموز بے خودی کو علیحدہ، گلشن راز جدید کو علیحدہ، جاوید نامہ کو الگ اس قسم کے کام کسی حد تک پاکستان میں ہوئے ہیں لیکن افسوس کہ پاکستان کی عوام ان تعبیرات سے صحیح طور پر فائدہ نہیں اٹھا سکتے کیونکہ وہاں پر فارسی پہلے کی طرح رائج نہیں ہے ہمارے پاکستانی بھائی جو یہاں موجود ہیں اور اسی طرح برصغیر ہندوستان کے تمام ادیب اپنا فرض جانیں کہ فارسی زبان کے سلسلے میں خیانت آمیز سیاست کا مقابلہ کریں اور فارسی زبان کو جو عظیم اسلامی ثقافت کا ذریعہ ہے اور خود اسلامی ثقافت کا بڑا حصہ فارسی زبان میں اور فارسی زبان پر منحصر ہے برصغیر ہندوستان میں جہاں پر مسلمان اصلی عنصر ہیں رواج دیں اور ہمارے خیال میں

خاص طور پر پاکستان میں یہ کام تیزی کے ساتھ ہونا چاہیے اور خود ہمارے ملک میں بھی مختلف اشاعتی امور جو انجام نہیں پائے، انجام پانے چاہئیں اور ہنر مند حضرات اقبال کے کام پر فنکاری دکھائیں، گلوکاری ان شعروں کو پڑھیں، ان پر دھنیں تیار کریں اور ان شائ اللہ ان کو رواج دے کر ہمارے جوان اور بوڑھے عوام کی زبان اور دل میں لائیں۔

ہمیں امید ہے کہ خداوند تعالیٰ ہمیں توفیق عطا کرے گا کہ ہم اپنی حد تک امت اسلامیہ پر اقبال کے عظیم حق کو ادا کر سکیں۔

تکمیلی پیغام

جناب ڈاکٹر مجتبوی صاحب

صدر، تجلیل اقبال کمیٹی

اگر چہ آج کی تقریر میں علامہ اقبال کی شخصیت کے پہلوؤں پر صرف مختصر روشنی ڈالی گئی اور قرن حاضر کی اس عظیم شخصیت کے بارے میں کچھ زیادہ بیان نہیں ہوسکا لیکن دونکتوں کا بیان جس کا ذکر نہ کرنا درحقیقت اقبال پر ظلم ہوگا، ضروری سمجھتا ہوں:

پہلا نکتہ قیام پاکستان کے سلسلے میں ہے جو یقینی طور پر اقبال کی زندگی اور شخصیت کے نمایاں ترین نکات میں سے ہے۔

حقیقتاً یہ کہنا ضروری ہے کہ پاکستان کے بانیوں اور ان میں سرفہرست قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم نے اقبال کی اس جاودانی نصیحت پر جو وہ مسلمان انسان کو مخاطب کر کے کرتے ہیں کہ:

تو شمشیری ز کام خود برون آ
برون آ از نیام خود برون آ

شب خود روشن از نور یقین کن
ید بیضا برون از آستین کن

عمل کیا اور اپنی انتھک محنت کوششوں اور جدوجہد کے ذریعے اس فکر کو جس کو علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں ہونے والی مسلم لیگ کانفرنس میں پیش کیا تھا، سترہ سال بعد عملی جامہ پہنایا۔

پاکستان کا قیام جو ہندوستانی مسلمان کی شخصیت کے تحفظ اور احیا کا واحد ذریعہ تھا یقیناً اقبال کے عظیم فخریہ کاموں میں سے ایک ہے۔ مسلمانوں کے ہندوستان سے الگ ہونے کے سلسلے میں جواہر لعل نہرو سے قائداعظم کی بحثوں میں جو دلیلیں نظر آتی ہیں اور جن کی بنیاد ہندوستانی مسلمانوں کا ایک خود مختار قوم بننا ہے، یقیناً رموز بے خودی اور اقبال کے دوسرے کلام میں موجود اقبال کے نظریات پر مبنی ہے لہٰذا جیسا کہ خود پاکستانی بھائیوں نے کہا ہے اور اس بات کی تکرار کی ہے، بلاشک اقبال پاکستان کے معمار اور پاکستان کا منصوبہ بنانے والے برصغیر میں مسلمانوں کو ایک خود مختار قوم کی شکل دینے والے ہیں۔

دوسرا نکتہ جو ہمارے ملک کے مسلمان اور عبادت گزار عوام کیلئے یقیناً دلنشین اور لذت بخش ہے، اقبال کی ذاتی خصوصیات کے بارے میں ہے۔ ہماری عوام کیلئے یہ جاننا ضروری ہوگا کہ اقبال جنہوں نے مغربی ثقافت اور تمدن کو اچھی طرح پہچانا اور اپنی عمر کے ایک اہم حصے کو مغربی افکار کی تعلیم حاصل کرنے میں صرف کیا، اپنے رویے اور طرز زندگی میں زاہدوں اور عابدوں میں سے ایک تھے اور وہ میل جول ان کے اسلامی اعمال اور آداب نیز ان کی ذاتی زندگی پر ہرگز اثر انداز نہیں ہوا۔

وہ عبادت گزار، قرآن سے مانوس، اہل تہجد اور ممنوعہ چیزوں سے پرہیز کرنے والے تھے اور حتی کہ یورپ میں اپنے طالب علمی کے زمانے میں بھی انہوں نے اس روش کو ہرگز ترک نہیں کیا۔ قرآن پر انکا اعتقاد اس حد تک زیادہ تھا کہ ان

کے فرزند جاوید اقبال کے بقول قرآن کی آیتوں کو درخت کے پتوں پر لکھ کر بیماروں کو شفا یابی کیلئے دیا کرتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، بیت اللہ اور حجاز سے جو وحی کا مرکز تھا عشق کرتے تھے۔ اسلامی علوم میں ان کی دلچسپی اس قدر زیادہ تھی کہ عمر کے آخری ایام میں چاہتے تھے کہ اپنی تمام کتابوں کو فروخت کر کے فقہ اور حدیث کی کتابیں خریدیں۔ وہ عارفانہ سوز و گداز رکھنے والے، تہجد کی نماز پڑھنے والے، زندگی کی پارسائی اور قناعت سے کام لینے والے نیز اسی قسم کی دوسری نمایاں خصوصیات کے حامل تھے۔

یہ وہ نکتے تھے جن کو میں اپنی تقریر کے تکملے کے طور پر اپنے ہم وطنوں کی اطلاع کے لئے عرض کرنا ضروری سمجھتا تھا۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
سید علی خامنہ ای